Existential Elements In Rizwan-u-haq's Novel "Khudkushi Nama"

رضوان الحق کے ناول "خودکشی نامہ" میں وجودی عناصر

Dr. Sara Majeed*[1]
Lecturer, Department of Urdu,The Women University, Multan
Sajida Aslam*[2]
PhD Scholar, Department of Urdu, The Women University Multan

ڈاکٹر سارا مجید☆[1]
لیکچرار، شعبہ اردو، دی ویمن یونیورسٹی، ملتان
ساجدہ اسلم☆[2]
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، دی ویمن یونیورسٹی، ملتان

Correspondance: sajidarao94@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 07-01-2026
Accepted:26-03-2026
Online:31-03-2026

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: In the twentieth century, existential philosophy sparked a new debate in the world. By the end of this century, much was written in the West on existence.Existence is a philosophy that brings a glow of light in human life. The founder of existential philosophy is considered to be Keric guard. In addition, the great name of the existential philosophy is that of Jean -Paul Sartre. Which believes that "existence is against the essence." In this article, Rizwan -ul -Haq's novel "Khud Khushi Nama" is reviewed in the presence of existential elements.

KEYWORDS: khud Khushi Nama, Philosophy, Existence, Keric guard, Rizwan ul ha Haq , Fear, Anxiety, Druil, Frustration, Joun paul sartar

ہم جس کائنات کا حصہ ہیں، اس کائنات کے ایک ایک ذرے میں اتنی معنویت اور راز پوشیدہ ہیں جن کو سمجھنا شاید اتنا آسان نہیں جتنا انسان نے اسے سمجھ لیا ہے۔ ہم جس طرح اس کائنات سے جڑے ہوئے ہیں شاید اس کی تفہیم اتنی ہی مشکل ہے جتنی کی انسانی نفسیات کی تفہیم۔ ہمارے روزمرہ کے کام ہوں، کوئی خاص تجربہ ہو یا سائنس اور مذہب پر سوال اٹھائے جائیں، یہ سب ایک عام انسانی عقل سے بالاتر کی چیزیں ہیں۔ دراصل اِن سب کا تعلق انسانی وجود سے ہے۔ جب تک انسان ان تمام سوالات کی تفہیم نہیں کرلیتا اس کائنات میں انسانی وجود پر سوالیہ نشان پیدا ہوتے رہیں گے۔ ان سب سوالوں کے جواب ہمیں وجودیت کے فلسفے میں مل جاتے ہیں۔ اس فلسفے کے وجود سے پہلے مختلف یورپی افراد فکری عوامل کی نسبت عقلی دلائل پر زور دیتے تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ انسان نے اپنے وجود کو سمجھنا شروع کیا اور ایک نئی بحث کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اگر ہم آج کے جدید عہد کی بات کریں تو یہ عہد بہت سی تبدیلیوں اور بدلتے رویوں کی صدی ہے۔ دراصل یہ تبدیلی از حد ضروری تھی۔ کیوں کہ ایک فرد وہی گھسے پٹے راگ سے اکتا چکا تھا، اس طرح یہ تبدیلی ہر طرف ناگزیر ہو چکی تھی۔ ادب میں بھی اس تبدیلی کے رخ کو دیکھا گیا۔ ادب نے بھی زمانے کے ساتھ اپنے آپ میں کافی تبدیلی کی۔ ادیبوں فلسفے جیسے منفرد، اچھوتے اور مشکل پسند موضوعات کو اپنے فن پاروں کا حصہ بنانا شروع کیا۔ اس طرح ادب میں ان تبدیلیوں کی سبب علمی و فکری سطح پر بہت سی تبدیلیاں دیکھنے کی ملی۔

ادیب نے جب فلسفہ جیسے مشکل موضوع پر اپنا قلم اٹھایا تو اس کی سوچ کے محور کو مزید تقویت ملی اور اپنے نظریات و فکریات کی تفہیم کرتا چلا گیا۔ سماج اور معاشرے کا حصہ بنے فرد کی شخصیت پر اثر پذیر عناصر کو فلسفے کی آنکھ سے دیکھ کر اس کو ادب کا حصہ بنایا۔ ان تمام فکری رجحانات میں ایک رجحان کا نام وجودیت ہے۔ جس نے اپنی خاص فکر اور سوچ کی بنا پر ادیب کو اپنی طرف مائل کیا اور اس کو لکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس فلسفے کا بانی سورین کرکیگارڈ کو مانا جاتا ہے۔ سورین کرکیگارڈ نے اپنی کتابوں میں اس فلسفے پر کافی لکھا ہے۔ ان کتابوں میں The Concept of Fear and Crumbling , Dread اور Sickness of Death قابلِ ذکر ہیں۔

ادب کے ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ فلسفہ جنگ دوم کے بعد یورپ میں پھیلے شورش اور بغاوت کے نتیجے میں سامنے آیا۔ اس شورش زدہ ماحول نے جہاں انسانی زندگی کو متاثر کیا وہیں پر سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کو بھی تبدیل کر دیا۔ یہ وہ دور تھا جب ہر طرف مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہر شخص اپنی ذات سے بے زار اور مایوس ہو چکا تھا۔ انھی حالات میں وجودی فلاسفر وں نے افراد کے اندر سے مایوسی اور ناامیدی کو نکالنے کی کوشش کی۔

عصر حاضر کے ادیب نے اس فلسفہ کو اپنی تخلیق کا حصہ بنایا۔ عصر حاضر کا ادیب جہاں موضوعات کے تنوع میں گھرا ہوا ہے وہیں پر فلسفہ میں بھی دلچسپی لے رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ فلسفہ مغرب سے مشرق کی طرف آیا۔ مشرقی ادیبوں

نے اس فلسفے کو ہاتھوں ہاتھ لے کر اس پر لکھنا شروع کیا۔ ان بڑے ادیبوں میں بڑے بڑے نام شامل ہیں۔ ان میں انتظار حسین، خالد جاوید، خالد حسن، انیس ناگی اور عاصم بٹ کے نام قابل ذکر ہیں۔ انھی بڑے ناموں میں ایک معروف نام رضوان الحق کا بھی ہے۔ جن کے ناول "خودکشی نامہ" میں وجودی عناصر کی چھاپ نظر آتی ہے۔

ناول پر بات کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ آیا وجودیت کیا ہے؟ وجودیت کا ماخذ لفظ "وجود" ہے جو کہ انگریزی کے لفظ Existence کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ "اِس کے لغوی معنی ظاہر ہونا، نمائش ہونا، پیدا ہونا اور شہودی مقابل کے ہیں۔" (1)

فلاسفروں کے ہاں روز اول سے معروضیت اور موضوعیت پر بات کی جاتی رہی ہے۔ کبھی انسان کے داخل کو بنیاد بنا کر کلام کیا گیا تو کبھی اس کے خارج کے مظاہر پر بات سننے کو ملی۔ کسی نے روحانیت کی بات کی تو کسی نے عقلی دلائل کو سامنے رکھا۔ تصور، روح، جذبات اور احساسات کے درمیان ایک نظریے کی پیدائش ہوئی اور وہ تھا وجودی فلسفہ۔ ژاں پال سارتر جو کہ ایک مشہور ڈرامہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کے لکھی تحریروں میں وجودی عناصر بہت نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ آپ بغیر سارتر کو پڑھے وجودیت کی تفہیم نہیں کر سکتے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> "وجودیت وہ طرزِ فکر ہے جو انسانی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اس کی ترکیب کے ذہنی اور عقلی پہلوؤں کی بجائے جذباتی پہلو پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔" (2)

وجودی فلسفہ میں فرد کی آزادی پر بات کی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جو کہ روایت سے ہٹ کر ہے۔ یہ قیاسی فلسفیانہ کا متضاد ہے۔ وجودی فلسفہ انسانی سوچ کے محور کو بنیاد بنا کر اپنی توانا آواز عام فرد تک پہنچانے کا کام کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہیگل جیسے فلاسفر کے نظریات کی نفی کرتا ہے۔ اس فلسفے کے تحت انسانی جذبات، احساسات اور خیالات کو سمجھنے میں آسانی ہوئی ہے۔ اس فلسفے کے تحت فرد کا وجود ہی مرکز محور ہونا چاہیے۔ تھامس فلینن لکھتے ہیں۔

> "Existentialism is a philosophy of freedom. Its basisis the fact that we can stand back from our lives and reflect on what we have been doing. In this sence, we are always more than ourselves. But we are as responsible as we are free. (3)

وجودیت ایک ایسا فلسفہ حیات ہے جو کہ اس کائنات میں موجود انسان کے وجود، آزادی انتخاب،خود کشی اور تنہائی جیسے موضوعات پر بحث کرتا ہے۔ وہ سوال اٹھاتا ہے کہ میرا وجود اس دنیا میں کیا معنویت رکھتا ہے؟ یا میں اس دنیا میں آخر کیوں بھیجا گیاہوں؟ فرد انسانی زندگی کے مقصد تخلیق کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وجود کی تفہیم ہو سکے۔

وجودیت دراصل آزادی، انتخاب اور ذات کی پہچان کا ایک نام ہے۔ وجودی طبقے کا ماننا ہے کہ انسان کو ہر چیز کی آزادی ہونی چاہیے اس پر کسی قسم کی کوئی مذہبی، سماجی یا اقتصادی قدغن نہیں ہونی چاہیے۔ وجودی تصورات میں بھی دوراستے موجود ہیں۔ ایک ان فلاسفروں کا راستہ ہے جو کہ خدا کو مانتے ہیں جب کہ دوسرے وہ ہیں جو ملحد ہیں۔ پہلے والی صف میں کرکیگارڈ، ہائیڈگر مارٹن اور مارسل کے نام شامل ہیں۔ جب کہ مواخر الذکر میں ژاں پال سارتر، پاسکل، نطشے اور ہیڈیگر کے نام قابل ذکر ہیں۔

> "وجود اس کے جوہر پر مقدم ہے"کا دعویدار سارتر کا ماننا ہے کہ فرد اس دنیا کو جانچنے پرکھنے اور اس پر غوروفکر کرنے سے پہلے اپنے وجود کا مشاہدہ کرے۔ اس طرح ایک انسان کا وجود سارتر کے نزدیک بنیادی حیثیت کے طور پر نمودار ہوتا ہے"(4)

وجودی فلسفے پر ہر عہد میں کچھ نا کچھ لکھا جاتا رہا ہے۔ لیکن اکیسویں صدی کا ادیب اور قاری فلسفے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اردو ادب کی بابت بات کی جائے تو کافی عرصہ ناول کے موضوعات پر جمود طاری رہا۔ لیکن جدید عہد کا ادیب اپنے ناول کو ایک نئے رنگ سے آشنا کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ انھوں نے فلسفے جیسے مشکل موضوع کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا۔ کرب، اضطرابی، تنہائی اور خود کشی جیسے وجودی عناصر کو اپنے فن پاروں کی زینت بنا کر سب کو حیران کر دیا۔ رضوان الحق کا نام بھی انھی بڑے ادیبوں میں شامل ہے جنھوں نے وجودیت جیسے مشکل موضوع کا انتخاب کیا اور اس کو اپنے ناول ''خود کشی نامہ'' میں پیش کیا۔ طالب جو کہ اس ناول کا کلیدی کردار ہے وہ اپنے وجود کو اس معاشرے کی بے حسی میں تلاش کرتا ہے۔ سماج کے بنائے گئے اصول وضوابط میں اپنے کردار کی پرچھائیں کا سراغ لگانے کی سعی کرتا ہے لیکن وہ ہر بار نامراد رہتا ہے۔ وہ ہر وقت خوف کے سائے میں رہتا ہے اور ناول کے اختتام تک وہ اس سے آزاد نہیں ہو پاتا۔ اس کا شعور، عقل اس کا ساتھ نہیں دیتی کیوں کہ وہ جس سماج کا حصہ ہے اسی سماج نے اسے اِس رستے پر لا کھڑا کیا ہے۔ ''خود کشی نامہ'' رضوان الحق کا ایک شاہ کار ناول ہے۔ اس ناول کو 2022ء میں قارئین کے لیے پیش کیا گیا۔ اس ناول کو مصنف نے گیارہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اس ناول کی انفرادیت یہ ہے کہ ہر باب کی شروعات وہ ایک ایسے واقعے یا کہانی سے کرتے ہیں جو اس باب کی تلخیص ہوتا ہے۔ اس ناول میں چھوٹی چھوٹی ضمنی کہانیوں کے بل بوتے ناول کا پلاٹ بُنا گیا ہے۔ جس سے ناول نگار کا فن ہمارے سامنے کھل کر آجاتا ہے۔

اس ناول کا مرکزی کردار وجودی عناصر کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ مرکزی کردار طالب پوری کہانی میں اپنے وجود اور ذات سے گریز برتتا ہے ہے کیوں کہ اس کو اپنے وجود سے گھن آنا شروع ہو جاتی ہے۔ وہ ایک ایسے خوف اور ڈر میں مبتلا ہے جس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل تھا۔ وہ معاشرے کی طرف دیکھتا ہے اس کے بنائے گئے اصولوں کو اپنے اوپر لاگو کر لیتا ہے لیکن اپنی ذات کو تلاش کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ یہ کردار ناول کے اختتام تک عجیب اضطرابی کیفیت لیے اپنے وجود اور سماجی رویوں کو لے کر لڑتا رہتا ہے۔ آخر میں جیت سماج کی ہو جاتی ہے۔

"میں زندگی سے اوب گیا ہوں، یہ شہری اور جدید زندگی بڑی بے مروت ہے، اس میں انسان کی کوئی قدر نہیں ہے۔ میرا اس دنیا سے موہ بھنگ ہو گیا ہے۔"(5)

اب تک جتنے بھی وجودی مفکرین اس فکر پر بات کر چکے ہیں جن میں کرکیگارڈ، ہائی ڈیگر یا اونا موہو سب ایک چیز پر متفق نظر آتے ہیں اور وہ ہے انسانی احساسات و جذبات۔ ان وجودی فلاسفروں کے نزدیک یہ جذبات اور احساسات کسی بھی فرد کے لیے قیمتی متاع سے کم نہیں ہے۔ یہ فلسفہ کبھی بھی عقلی دلائل سے بحث نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے معاون یہ فلسفہ کبھی بھی عقل دلائل سے بحث نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے معاون ثابت ہوتا ہے۔ یہ انسانی جذبات کو سمجھ کر اس کے باطن میں چھپے ڈر کو باہر نکالنے کی سعی کرتا ہے۔ مندرج بالا اقتباس کو اگر وجودی فلاسفر ہائی ڈیگر کی تھیوری پر جانچے تو ہمیں معلوم ہو گا کہ احساس و جذبات کسی بھی ذہنی کیفیت کو الفاظ کے قالب میں ڈھال کر استعمال کر سکتا ہے۔ جب ایک فرد کسی ناگہانی صورتحال سے دوچار ہوتا ہے تب اسے صرف معروضی آگہی کا نام نہیں دیا جا سکتا بلکہ وہ ایک الگ کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ ادراک فرد کو احساس کی اہمیت بتاتا ہے۔ انسان کے باطن میں بھی دو مختلف پہلو اجاگر ہوتے رہتے ہیں۔ ایک مثبت ہوتا ہے جب کہ دوسرا منفی ہو سکتا ہے۔ منفی صورت حال میں انسان خوف، اذیت، کرب، نفرت اور دکھ جیسے عناصر سے نبرد آزما ہوتا ہے اور یہ سب چیزیں وجودی فلسفے میں بیان کی جاتی ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار طالب بھی انھی حالات کا سامنا کرتا ہے۔ جس کے باعث وہ بار بار خودکشی کرنے کا سوچتا ہے۔ وہ اس خوف اور ڈر کے سائے کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر نامعلوم سفر کی طرف چل پڑتا ہے۔ اس پر ڈر بہت حاوی ہو چکا ہوتا ہے۔ تب خودکشی کا ایک اچھوتا خیال اس کے ذہن کو بار بار مفلوج کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

"میری ہمدم دیرینہ خودکشی نے دستک دی جو میری ہمزاد بن کر ساتھ ساتھ چل رہی تھی، وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ اب تو سب کو معلوم ہو گیا ہے، کب تک بھاگو گے؟ کس کس سے بھاگو گے؟ کہاں کہاں بھاگو گے؟ اس ذلیل زندگی کو حاصل کر کے بھی کیا کرو گے؟ اس طرح تم روز ذلیل ہو گے

کبھی سماج اور دنیا تمھیں ذلیل کرے گی، کبھی دوست اور احباب ذلیل کریں
گے اور کبھی خود اپنے ضمیر کا سامنا ہوا تب بھی ذلیل ہو گے۔"(6)

مرکزی کردار کی اس عجیب سی کیفیت کو رضوان الحق نے بڑے انوکھے اور فنی طریقے سے اپنی تخلیق کا حصہ بنایا ہے۔ وہ طالب کی نفسیات کو وجودی فکر میں دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے ایک ایسا کردار تخلیق کیا ہے جو اپنے آپ میں پراسرار تھا۔ وہ اکیلا تھا، خوف زدہ تھا، ڈرا ہوا تھا۔ اس ڈر اور خوف کی وجہ سے موت آسان لگنا شروع ہو گئی۔ اسے اپنے حال اور ماضی کی چند یادوں سے جیسے وحشت شروع ہو جاتی ہے۔ وہ جلد از جلد اس دنیا سے جانا چاہتا ہے تا کہ اپنے وجود کو ان پریشانیوں سے نجات دلا سکے۔ وجودی فلاسفر اوناموکا تصور بھی یہی تھا کہ انسان روز اول سے عدم تحفظ کا شکار رہا ہے۔ جب فرد پر کوئی مشکل آتی ہے تو وہ زندگی سے بےزار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس کے سامنے خودکشی کا راستہ آسان تر ہو جاتا ہے۔ ناول کا کردار طالب بھی اونامو کی فکر اور تصور پر کھرا اترتا ہے۔ وہ ماضی اور حال کے دھندلکوں میں کچھ امید کی کرن تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اسے سوائے اندھیری شب کے کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی۔ اسی وجہ سے وہ خودکشی کو اپنی ہم زاد سمجھ کر اس کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔

وجودی فلاسفر ژاں پال سارتر کا ماننا ہے کہ یہ کائنات اور انسان ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اس کا مزید کہنا ہے کہ اس کائنات کا حصہ بن کر اپنے اعمال کر جانا تو ٹھیک ہے لیکن اپنے آپ کو اس دنیا کا تصور کر لینا سراسر غلطی ہے۔ اس طرح ایک فرد اپنی ذات کے تصور میں گم ہو کر اپنے وجود سے مبرا ہو جاتا ہے۔ جب ایک فرد اس دنیا میں کوئی بھی اعمال کرتا ہے تو اس عمل کے دوران جو شے سب سے زیادہ عمل دخل کر رہی ہوتی ہے وہ اس انسان یا فرد کا اپنا جسم ہوتا ہے۔ وجودیوں کا ماننا ہے کہ اگر انسان اپنے وجود سے انکار کرے گا تو وہ مردہ تو تصور کیا جا سکتا ہے لیکن زندوں کی فہرست میں شامل نہیں ہو گا۔ جب ایک انسان جنسی عمل میں مگن ہو تب اس کو اپنے وجود کا احساس بھی ہوتا ہے اور اس نعمت سے آشنا بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس عمل کے دوران اگر اس کو اپنے وجود کا ذرا بھر بھی نہیں پتہ تو وہ اپنے وجود سے انکار کر رہا ہوتا ہے۔

اس ناول کا مرکزی کردار جب خود کو اذیت اور خوف کی فضا میں دیکھتا ہے تب اسے ماضی یاد آتا ہے۔ رما بالا کا ایک کردار جو جنسی عمل کی آسودگی نہ ہونے کے سبب خودکشی کر لیتی ہے تب طالب اس کو یاد کرتا ہے۔

"میں جنون کی حد تک خودکشی میں یقین رکھنے والا شخص، آج زندگی میں پہلی
بار کسی خودکشی کو اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا۔"(7)

خود کشی نامہ کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کے ذہن میں بہت سے سوال ابھر کر سامنے آتے ہیں؟ سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مرکزی کردار خود کشی اور خود کشی نامہ کی ہی بات کیوں کرتا ہے؟ اہم سوال یہ بھی ہے کہ جو شخص اس دنیا سے خود کشی کا راستہ اختیار کر کے چلا جاتا ہے، کیا وہ اس معاشرے اور سماج کے مقتول نہیں کہلائیں گے؟ رضوان الحق جیسے بڑے ناول نگار نے ان تمام پہلوؤں پر غور وخوض کرنے کے بعد ان سوالات کے جواب بھی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ قاری کسی ابہام کا شکار نہ رہے۔ ان کا ماننا ہے کہ سماجی رویوں میں تبدیلی خود کشی جیسے اقدام کو کافی حد تک کم کرنے میں معاون ثابت ہو گی۔ سماجی حقیقت اور رویوں میں مثبت تبدیلیاں لانا از حد ضروری ہے۔ مثبت رویوں کے سبب فرد انتخاب کرتے وقت بہت سوچتا ہے۔ وہ بہتر سے بہتر انتخاب کرنے میں آزاد ہو گا۔ اسی ناول کا کردار رمابالا اپنے شوہر کی غلط باتوں پر سر خم تسلیم کر لیتی ہے اور شوہر کے دوست کے ساتھ ہم بستری کر لیتی ہے۔ تب اس کو اپنے وجود کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔ کیوں کہ وہ سماجی رویوں کے سبب سب کچھ کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ جب اس کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں بچا تب اس نے خود کشی کر لی۔

انسانی زندگی پر جہاں جنسی تعلقات اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کو بہت کچھ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ وہی ایک پہلو مایوسی، اضطراب اور محرومی کا بھی رہتا ہے۔ وجودی فلسفے کے نزدیک مایوسی، ڈر خوف اور دہشت ہر فرد میں موجود ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں اس وقت سامنے آتی ہیں جب اس کو کوئی دوسرا راستہ نہیں مل رہا ہوتا۔ پھر وہ سوچتا ہے کہ اِس کو دنیا میں بھیجا ہی کیوں گیا؟ وہ اپنی ذات کی نفی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کرکیگارڈ کے نزدیک جب کوئی فرد اپنی جوانی کے عین وسط میں سب کچھ حاصل کر لیتا ہے تب وہ ان حاصل شدہ چیزوں سے تنگ آجاتا ہے۔ پھر اس کے اندر مایوسی کا اظہار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ تب یہی مایوسی اسے ڈر اور خوف کے سائے میں لے جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ فرد اندر سے کھوکھلا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر وہ دنیاوی چیزوں سے اکتا کر موت کی طلب میں لگ جاتا ہے۔ احسان اشرف لکھتے ہیں۔

> "مایوسی کی کیفیت کو ہائیڈیگر نے ایک قسم سے فرد کی بے بسی اور خالی پن
> سے تعبیر کیا ہے، جو فرد کے اندر تشویش اور دنیا سے لگاؤ پیدا کرتا ہے اور
> ایک بے بس، متردو فرد کے اندر رفتہ رفتہ ایک لا فہم میں ہضم ہو جانے کا
> احساس پیدا کرتا ہے۔"(8)

مایوسی، ڈر، خوف اور اضطراب جیسی کیفیات فرد کو ایک پل کے لیے اندر سے ہلا دیتی ہیں۔ جب مایوسی اندر تک جڑ پکڑ لیتی ہے تو فرد کو کچھ بھی نہیں سوچ سکتا۔ وہ ظاہری اور باطنی طور پر کمزور ہو جاتا ہے۔ اس فرد کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔ اس کو اگر روشنی کی ایک جھلک نظر بھی آتی ہے تو وہ موت ہوتی ہے اور بالآخر وہ خود کشی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

خود کشی نامہ کا ایک کردار جو کہ چچا غفور کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہ اسی کیفیت کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ کھیتی باڑی میں نقصان، بنک سے قرضے لینا اور بروقت واپس نہ کرنا، بیجوں کی افزائش نہ ہونا اور کھاد سپرے کا ناقص ہونا، یہ تمام عوامل مل کر اس کو مایوسی کی طرف لے جاتے ہیں۔ رضوان الحق نے اس کردار کے ذریعے ہمارے سماج پر مسلط کچھ شر پسند عناصر کو بھی بڑی چابک دستی سے بیان کیا ہے۔ وہیں پر وجودی عناصر جیسا کہ کرب، مایوسی، دکھ، الم، اضطراب جیسی کیفیات کو بھی بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔

> "چچا جان اب تک قرضے میں کافی ڈوب چکے تھے، اس قرض سے نکلنے کی کوئی امید نظر نہ آئی تو اگلے روز کھیت جاتے وقت پیسٹی سائیڈ بھی لیتے گئے جو کیڑوں کو مارنے کے لیے لائے تھے، لوگوں سے نظریں بچا کر اسے پی لیا۔ تھوڑی دیر اپنے کھیتوں میں تڑپے اور پھر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔"(9)

ایسا عمل جو سماج یا معاشرے کے چند عناصر کے سبب آپ پر مسلط کر دیئے جاتے ہیں۔ ان چیزوں کا سامنا کر کے ختم کرنا چاہیے نا کہ موت کا انتخاب کر کے اپنے وجود کو بھی اذیت دی جائے اور پیچھے رہ جانے والے افراد کو بھی اذیت سے گزارا جائے۔ انسان کو جب اس دنیا میں بھیجا جاتا ہے تو اس کی ذات تنہا ہی ہوتی ہے۔ سارتر کا ماننا ہے کہ انسان کو آزادیِ انتخاب کا حق ہونا چاہیے۔ لیکن صحیح اور غلط کا فیصلہ بھی خود انسان کو کرنا چاہیے۔ اب یہ انسان کی ذہنی سطح پر منحصر ہے کہ وہ منفی پہلو استعمال کرتا ہے یا مثبت کی طرف جاتا ہے۔

وجودیت پسندوں کا ماننا ہے کہ جب انسانی وجود اس کائنات میں پیدا ہونے کے بعد اپنے جوہر، کردار، مقصد اور شخصیت کے ذریعے اپنے وجود سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے تب وہ اپنی ذات کی تشکیل کو مکمل کر لیتا ہے۔ وجودی فلاسفر کرکیگارڈ اور نطشے کا ماننا ہے کہ انسان کو چاہیے وہ اپنے صحیح اور غلط کا فیصلہ خود کرے نا کہ اجتماعیت اور انفرادیت کے چکر اپنے وجود سے فرار حاصل کر لے۔ نطشے کے قریب جب کوئی فرد اپنی سمت کا صحیح تعین کر لیتا ہے تو وہ سماج کو بھی صحیح راستہ دکھا سکتا ہے اور اس میں مثبت تبدیلیاں پیدا کر سکتا ہے۔ اس ناول کے بیشتر کردار اپنے وجود سے انکاری نظر آتے ہیں۔ اگر اسی چیز کو سارتر کے تصور سے دیکھیں تو اس کا کہنا ہے کہ انسان کو فیصلہ گوئی میں ہمت کرنی چاہیے۔ وہ فوراً سے پہلے فیصلہ کرے کہ انکار کرنا ہے یا قرار کرنا ہے۔ سارتر کا ماننا ہے کہ جب فرد اپنی ذات کو لے کر کچھ نہیں کر پاتا تب معاشرے کا کوئی بھی فرد اس کی مدد کو نہیں آتا۔ کمزور، مایوس اور ڈرا ہوا شخص صرف خود کشی ہی کر سکتا ہے۔ اسی بات کو عامر حسینی کچھ اس طرح لکھتے ہیں۔

"معتبر وجود کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ وہ ماحول سے کٹ کر رہ جائے، کیونکہ اس کا ہر عمل اور ہر فیصلہ ماحول سے وابستہ ہے۔ فرد کے معتبر ہونے کا ثبوت اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اس حد تک نمایاں رہے کہ اس کی آزادی، فیصلہ کرنے کی قوت، ذمہ داری اور احساس ذمہ داری اس سے چھن نہ جائے۔"(10)

خود کشی نامہ رضوان الحق کا پہلا ناول ہے۔ انھوں نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے جو کہ ہمارے معاشرے کا ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ انسان کے جذبات، احساسات اور سوچ کا محور کس کو ہونا چاہیے ان سب سوالوں پر رضوان الحق نے بڑی چابک دستی سے لکھا ہے۔ جب وجودی فلسفے کی بازگشت مشرق میں سنائی دینے لگی تو رضوان الحق جیسا مدبر اور دانا شخص کس طرح اس موضوع پر نہ لکھتا۔ اس ناول میں ہمیں جہاں معاشرے کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر ملتا ہے وہیں پر انسانی سوچ کی تفہیم بھی کی گئی ہے۔ ساتھ ساتھ وجودی فلسفے کے عناصر بھی ہمیں نظر آتے ہیں۔ یہ ناول سارتر اور کرکیگارڈ کے وجودی سوالات پر بحث کرتا نظر آتا ہے۔ ان تمام سوالات کے ممکنہ جوابات بھی ہمیں اس ناول میں مل جاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ناول اپنے پلاٹ، اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے اردو ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔

حوالہ جات

1۔ ابو نعیم عبد الحکیم جالندھری، قائد اللغات، لاہور: حامد اینڈ کمپنی، سن ندارد، ص: ۹۹۳

2۔ قاضی جاوید، وجودیت، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۸، ص: ۱۵

3۔ تھامس فلینن، Existentialism A very short Introduction، یوکے: آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۶، ص: ۸

4۔ قاضی جاوید، وجودیت، ص: ۱۵

5۔ رضوان الحق، خود کشی نامہ، لاہور، اجوک پبلی کیشنز ۲۰۲۲ء، ص: ۲۲

6۔ ایضاً، ص: ۲۴

7۔ ایضاً، ص: ۴۱

8۔ احسان اشرف، وجودیت کا فلسفہ، پٹنہ: کتاب منزل، ۲۰۱۰ء، ص: ۱۲۲

9۔ ایضاً، ص: ۵۹

10۔ عامر حیات حسینی، ڈاکٹر، وجودیت، سری نگر: بتول پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص: ۳۹

References:

1. Abu Naeem Abulhakeem Jalhndri, Quaid ul lugat ،Lahore:Hamid and com.،p 993
2. Qazi Javaid, "Wajoodiat", Lahore: Fiction House, 2018, p 15
3. Thomas Flynan, "Existentialism A very short Introduction" ,UK: Oxford university press, p 8
4. Qazi Javaid, "Wajoodiat" ,Lahore: Fiction House, 2018, p 28
5. Rizwan ul Haq, Khudkhusi nama, sahe mahi Lahore, sumara 4(2022)p:22
6. As above , p 24
7. As above, p 41
8. Ehsan Asraf, "Wajoodiat ka falsfa" , Patna: kitab manzil, 2010, p 122
9. As above, p 59
10. Amir Hayat Husaini, Dr "Wajoodiat" ,Seri nagar: Batool public kicenz, 1990, p 39